Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

JOURNAL PROFILE
Noor-e-Tahqeeq is a quarterly, HEC "Y" Category research journal of Lahore Garrison University, publishing peer-reviewed studies in Urdu language and literature since 2017. It provides a credible platform for original research and contemporary criticism.

CONTACT
Dr Muhammad Haroon Qadir
Editor, Noor e Tahqeeq
Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore 0303-3330345

Email
lgunt@lgu.edu.pk

Website
https://ojs.lgu.edu.pk/nooretahqeeq

ISSUE DETAILS
Volume 10, No 01
Jan to March 2026
Page No: 95-109

DOI
https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2026.100147

HISTORY OF THE PAPER
Received on: Jan 14, 2026
Accepted on: Feb 22, 2026
Published on: Mar 30, 2026

PUBLISHED BY
Department of Urdu,
Lahore Garrison University
DHA Phase 6, Sector C,
Avenue 4, Lahore

TITLE OF THE PAPER

The De-Colonial Perspective of Akbar Allahabadi's Poetry

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری ردِ استعماری تناظر میں

AUTHORS

Muhammad Shahzad Anjum
PhD Scholar, Department of Urdu and Eastern Languages
Govt. College University, Faisalabad

Dr Sumaira Akbar (Correspondence Author)
Assistant Prof, Department of Urdu and Eastern Languages
Govt. College University, Faisalabad

ABSTRACT

This research paper explores the de-colonial dimensions (Red-e-Iste'marit) within the poetry of the renowned Urdu satirist Akbar Allahabadi. Literature serves as a mirror to contemporary societal dynamics, and Urdu poets have historically wielded their pens as instruments of resistance against domestic oppression and foreign subjugation. Rather than relying purely on direct political rhetoric, Akbar employed wit, irony, and symbolism to expose the cultural, educational, and psychological dimensions of Western imperialism. Akbar's poetic trajectory is systematically analyzed across two primary phases: his early period, characterized by sharp critique of Westernization and Sir Syed Ahmed Khan's Aligarh Movement in the pages of Awadh Punch, and his later phase, which evolved toward political reform, national unity, and support for Mahatma Gandhi's de-colonial philosophy of non-violence. Through symbolic critiques of the Delhi Durbar, Charles Darwin's evolutionary theories, and the emergence of a submissive native bourgeoisie (or clerk culture), Akbar unmasked the hidden mechanisms of colonial hegemony (Ijaradari) and local opportunism. Ultimately, Akbar's poetry transcends mere nostalgia, serving as a vital literary resistance that emphasizes civilizational selfhood (Khudi) and highlights the severe human cost of surrendering cultural heritage for superficial modern progress.

KEY WORDS

Akbar Allahabadi, De-Colonialism, Awadh Punch, British Hegemony, Postcolonial Critique, Westernization, Cultural Identity.

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اکبر الٰہ آبادی کی شاعری ردِ استعماری تناظر میں

ادب تنقید حیات ہے جو اپنے دور کے عصری تقاضوں کی عکاسی کرتا ہے۔ شاعری اس کی روح ہے جو اسے روزِ اول سے توانا اور ترو تازہ رکھتی ہے۔ شاعری کے بغیر ادب کا وجود مکمل نہیں۔ اردو ادب کے تخلیق کاروں نے اس فرض کو ایمانداری کے ساتھ نبھایا ہے۔ حق وباطل کے میدان میں مقامی حکمران ہو یا بیرونی حملہ آور، اندرونی خلفشار ہو یا بیرونی مداخلت، دوست و دشمن کی پرواہ کیے بغیر ان کا قلم تلوار کی طرح برابر چلتا رہا۔ ہر دور اور ہر صنف کے تقاضوں کے مطابق اگرچہ ان کا ردعمل بھی مختلف رہا ہے لیکن ان کے پایہ استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ برائی روکنا، ظالم کی مخالفت اور حق کا ساتھ دینا، دنیا کے تمام مذاہب اور تہذیبوں کا بنیادی موضوع رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر چپ رہنا ایمان کا کم ترین درجہ کہلاتا ہے جب کہ مخالفت یا احتجاج مردانگی اور انسانیت کی خوب صورتی تصور کی جاتی ہے۔

اردو شاعری میں ردِ استعماریت کے ابتدائی نقوش دراصل برطانوی سامراج کے غاصبانہ اور غیر انسانی تسلط کے خلاف ایک فطری اور بتدریج ابھرنے والے ردِ عمل کی عکاسی کرتے ہیں، جس کا آغاز نو آبادیاتی نظام سے دلی بیزاری، نفرت اور ذہنی انکار کی پوشیدہ لہروں سے ہوا۔ جب استعماری جبر کو طاقت کے بل پر مقامی آبادی پر مسلط کیا گیا، تو شعرا نے شروع میں دھیمے اور علامتی لہجے میں اس ناروا عمل کی مذمت اور احتجاج کا راستہ اپنایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ احتجاج محض علامتی نہ رہا بلکہ مروجہ نو آبادیاتی قوانین اور فرنگی پالیسیوں کے خلاف ایک واضح مدافعانہ بغاوت اور آزادی کے انقلابی نعروں میں بدل گیا۔ یہ احتجاجی و انقلابی لہر جب متبادل سیاسی، سماجی اور فکری لائحہ عمل سے لیس ہوئی، تو اس نے ایک شعوری نصب العین کے تحت ترقی پسند تحریک جیسی عظیم الشان فکری تحریک کی شکل اختیار کرلی، جس نے برصغیر کے عوام کو غلامی کی زنجیریں توڑنے کا ایک واضح متبادل راستہ دکھایا۔

اردو میں ردِ استعماری شاعری کے یہ تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی پہلو نو آبادیاتی دور میں یکجا ہو کر سامنے آئے، جہاں برصغیر کے ادباء اور شعراء نے اپنے قلم کو ایک بے لچک تلوار میں بدل دیا۔ جب استعماریت نے نہ صرف سیاسی آزادی سلب کی بلکہ معاشی استحصال (جیسے جاگیر دارانہ نظام کی پشت پناہی)، مذہبی تفریق کی پالیسی اور ایک ناقص و جابرانہ نو آبادیاتی ڈھانچہ مقامی عوام پر تھوپ دیا، تو اہل قلم نے ان تمام ناانصافیوں کے خلاف فکری مورچہ سنبھال لیا۔ انہوں نے ایک طرف جہاں انگریز کی لائی ہوئی انتہاپسندی اور مذہب دشمنی کے خلاف آواز اٹھائی، وہیں دوسری طرف غریب کسانوں اور مزدوروں پر ہونے والے معاشی جبر کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ استعماریت کے اس کثیر الجہتی ظلم کے خلاف قلم کے ذریعے مزاحمت کی یہی شعوری کوشش دراصل ردِ استعماریت کا وہ نقطۂ عروج ہے جس نے جبر کے نظام کی جڑیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس حوالے سے اشفاق احمد لکھتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

"ادب کی اصطلاح میں کسی بھی غیر انسانی رویے کو الفاظ کے ذریعے روکنے کی کوشش کو ردِ استعماریت کا نام دیا جاتا ہے۔"(1)

استعماری طاقتوں نے جب برصغیر کے باسیوں سے ان کے بنیادی، پیدائشی اور فطری حقوق جیسے اپنی زمین پر خود مختاری اور آزادیِ فکر و عمل چھیننے کی کوشش کی، تو یہاں کے عوام اور شعرا کے دلوں میں اس جابرانہ نظام کو رد کرنے کی چنگاری بھڑک اٹھی۔ استعماریت کے اس وحشیانہ جبر کے سامنے ہر فرد کی قوتِ برداشت نے الگ ردِ عمل دیا بعض مصلحت پسندی کی نذر ہوئے تو بعض نے اپنے حریت پسندانہ رویے سے تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اردو کے ردِ استعماری شعرا نے یہ ثابت کیا کہ انسانی حقوق کا غصب ہونا ہی دراصل اس مادی دنیا میں مزاحمت کا سب سے بڑا محرک بنتا ہے اور جب انسان کی خودداری اور پیدائشی آزادی پر شب خون مارا جائے تو ہر ذی روح اپنی انفرادی اور اجتماعی قوت کے مطابق اس ناانصافی کے خلاف سینہ سپر ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب و شاعری میں بھی ردّ استعمار کی روایت بہت پرانی ہے۔ امیر خسرو سے لے کر جدید دور کے ہر شاعر کے ہاں ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں جس میں کسی نہ کسی حوالے سے رد استعمار کا سراغ ملتا ہے۔ جہاں تک اردو شاعری میں رد استعمار کے آغاز کی بات ہے تو اس کے لیے کوئی باقاعدہ تاریخ مقرر کرنا تو ناممکن ہے کیوں کہ ہندوستان میں استعماری دور کا آغاز سولہویں صدی میں پرتگیزیوں کی آمد سے ہوتا ہے جنھوں نے تجارت میں جارحانہ انداز اختیار کر کے مقامی لوگوں کا استحصال شروع کیا، لیکن شاعری میں ردّ استعمار کے واضح اشارے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ملتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی شعراء نے اس موضوع پر لکھا ہو لیکن صنف نظم کے مزاج اور علامتی و استعاراتی انداز کی وجہ سے آج کے قاری کے لیے اُن علامتوں کی تفہیم مشکل ہے۔

اکبر الہ آبادی کی شاعری مغربی استعماریت کے سیاق میں دراصل برصغیر کے اس ذہنی و تہذیبی بحران کی شعری دستاویز ہے جسے نوآبادیاتی نظام نے جنم دیا اور جس کا اثر محکوم قوم کے شعور، زبان اور سماجی اقدار پر پڑا۔ اکبر کی نظر میں مغرب صرف ایک جغرافیائی سمت یا سیاسی قوت نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر تہذیبی رویہ تھا جس کے پس منظر میں سرمایہ دارانہ ذہنیت، لارڈ میکالے کے تعلیمی خاکے سے پیدا ہونے والی ذہنی غلامی، اور ایسے متوسط طبقے کا ظہور شامل تھا جو اپنی ہی تہذیب سے حاشیہ بردار ہو کر انگریزی طرزِ زیست کو فخر کا معیار سمجھنے لگا۔ چنانچہ اکبر کی طنزیہ و ظریفانہ شاعری اس مغربی سامراجی بیانیے کے خلاف احتجاج بھی ہے اور داخلی محاسبہ بھی؛ وہ ریل، موٹر، گراموفون، پتلون اور کوٹ جیسی ظاہری علامتوں کے پردے میں اس پوری فکری یلغار کو بے نقاب کرتے ہیں جو مذہب، معاشرت اور زبان کو اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی۔ ان کے ہاں مغربی استعمار کی مخالفت محض جذباتی یا نعرہ باز نوعیت کی نہیں، بلکہ عہدِ حاضر کے تقاضوں، جدید تعلیم کی افادیت اور سائنسی ترقی کے امکانات کو سمجھتے ہوئے اس سوال پر مرکوز ہے کہ اگر ترقی کی قیمت اپنی شناخت، اخلاقی مرکزیت اور دینی و تہذیبی مسلمات کی قربانی ہو تو یہ سودا کتنا مہنگا ہے۔ اسی لیے اکبر ایک طرف سرسید اور ان کے رفقا کی اندھی تقلیدِ مغرب پر چوٹ کرتے ہیں اور دوسری

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

طرف اپنی قوم کو یہ باور کراتے ہیں کہ اصل معرکہ سیاسی اقتدار سے بڑھ کر تہذیبی خودی کا معرکہ ہے؛ ان کی شاعری کا تمہیدی مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ اردو نظم و غزل میں مغربی استعمار کے خلاف ایک بامعنی، باشعور اور ہمہ جہت ردِّ استعمار بیانیہ سب سے نمایاں طور پر اکبر ہی کے یہاں تشکیل پاتا ہے، جو طنز کے پیرہن میں مزاحمت، اصلاح اور بیداری تینوں کا امتزاج ہے۔

اکبرؔ الٰہ آبادی کے کلام کو عمر کے مختلف مراحل (طفلی، شباب اور شیب) کی بنیاد پر تین ادوار میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن نو آبادیاتی تناظر میں اکبرؔ کی نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے اِسے دو ادوار میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اکبر کی نظم نگاری کا پہلا دور اودھ پنچ کی اشاعت 1877ء سے سر سیّد احمد خان کی وفات 1899ء تک کا ہے۔ اِس دور کی نظموں میں مغربی تہذیب کے علاوہ سر سید احمد خان اور اُن کے رفقائے کار کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا، مذکورہ دور میں اکبرؔ کے علاوہ اودھ پنچ کے دیگر شعراء بھی علی گڑھ تحریک کو مسلمانوں کی گمراہی کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔ اِس دور میں اودھ پنچ کی شاعری کے دو بنیادی مرکزوں کو ''کھاڈبل روٹی، کلر کی خوشی سے پھول جا'' اور ''ابتر ہمارے حملوں سے حالیؔ کا حال ہے'' جیسے قطعات سے نشان زد کیا جاسکتا ہے۔ درج بالا دونوں مصرعے اودھ پنچ کے صفحات پر پروان چڑھنے والے اُن دو بڑے فکری رویوں کے اشارندہ ہیں، جنھوں نے مغربی استعمار کے ساتھ، پیر نیچر، اور اُس کے ہمنواؤں کو بھی طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا تھا۔

اکبرؔ کا ابتدائی شعری رجحان غزل گوئی کی طرف تھا اور وہ کلاسیکی شعریات کے زیرِ اثر اپنے استاد وحیدؔ الٰہ آبادی کے تتبع میں آتشؔ اور ناسخؔ کا رنگ اپنائے ہوئے تھے۔ اودھ پنچ کے اجراء 1877ء کے بعد اُن کی شعری میں تغزل کے اثرات بتدریج کم ہوتے چلے گئے اور اِس کی جگہ قومی، ملی اور سیاسی رنگ نمایاں ہونے لگا۔ اِسی زمانے میں اکبرؔ کے ہاں طنزیہ و مزاحیہ نظم گوئی کا آغاز ہوا اور اُن کے شعری بیانیے قدرے کھردرے اور غیر ہموار ہونے کے باعث نئے اسلوبیاتی سانچوں کی تشکیل کا باعث بنے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کے بقول:

> ''اودھ پنچ کے اجراء سے اکبر کو خیال ہوا کہ ''سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' کے انداز میں لوگوں تک مخالفانہ خیالات بھی پہنچائے جاسکتے ہیں اور گرفت سے بھی بچا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ اس زمانے میں مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہوئے ورنہ 1877ء سے قبل ان کی شاعری طنز و مزاح سے دُور تھی۔''(2)

اکبرؔ کے شعری سفر میں اودھ پنچ کا اجراء ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن کے کلیات میں موجود قدرے طویل نظم ''نامہ بنام اودھ پنچ 1877ء'' اودھ پنچ سے اُن کی ذہنی و جذباتی وابستگی کو سامنے لاتی ہے۔ یاد رہے کہ اکبرؔ نے یہ نظم اودھ پنچ کے ابتدائی زمانے میں لکھی تھی، یہ وہ دَور تھا جب اودھ پنچ کے فکری خدوخال ابھی پوری طرح واضح نہیں ہوئے تھے، لیکن اکبرؔ نے اپنی نگاہِ دُوربیں سے اودھ پنچ کو مغربی استعمار کے خلاف آواز بلند کرنے کا ذریعہ قرار دے دیا تھا۔ نظم کے ابتدائی اشعار میں اکبر، اودھ پنچ، کو ''لندن پنچ'' کا نقشِ ثانی قرار دیتے

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

ہوئے جہاں اسے نقشِ اولیں سے بہتر قرار دیتے ہیں، وہیں اُن مخالفین کے حسد کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں جو اودھ پنچ کی تحریروں کا نشانہ بننے کے بعد اس کے شدید مخالف ہو گئے تھے۔ چند اشعار دیکھیے:

کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ
محبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ
دن رات یہی ہیں اب تو چرچے
پرچاتے ہیں دل کو اِس کے پرچے
ہے خلقِ خدا قتیل اس کی
حاسد کا حسد دلیل اس کی(۳)

درج بالا نظم میں آگے چل کر اُس نو آبادیاتی جبر کے نقوش بھی سامنے آتے ہیں، جس کے تحت مقامی باشندوں کی صدائے احتجاج کو دبانے کے لیے آزادیٔ اظہار پر نت نئی پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔ اِس نظم کے باقی اشعار میں اکبرؔ استعمار کاروں کی طرف سے عائد پابندیوں کو براہِ راست تو اپنا موضوع نہیں بناتے لیکن اُس کا شعری استدلال کنایتاً بہت کچھ واضح کر دیتا ہے۔ 'گفتگو کی آزادی کا معیوب ہونا' نو آبادیاتی عہد میں رائج تعزیروں اور پابندیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اِن فکری جکڑ بندیوں کے ہوتے ہوئے 'استعمار کار' کے خلاف آواز بلند کرنا اتنی ہی احتیاط کا متقاضی تھا جتنا 'زبان' کا 'بتیس دانتوں کے درمیان رہ کر بات کرنا۔ آگے چل کر اکبرؔ اسی شاعرانہ دلیل کو رمزیہ پیرائے میں بیان کرتے ہوئے 'دریائے خیال' کی روانی کو 'یزداں' اور 'اہرمن' کے تثنیثی جوڑے سے منسوب کر دیتے ہیں۔ یزداں اور اہرمن کا تصور زرتشتی مذہب سے مستعار ہے اور اسے حق اور شر کی باہمی تفاوت کو واضح کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اکبر اِس تلازمے کے ذریعے نو آبادیاتی جبر اور اِس کے انسلاکات مثلاً مغربی تہذیب اور اِس تہذیب کی وکالت کرنے والوں کو باطل سے تعبیر کرتے ہیں، جب کہ اس کے مقابل موجود مزاحمتی بیانیہ اُن کے نزدیک حق کا درجہ رکھتا ہے۔ اِس نکتے کو مزید واضح کرنے کے لیے اُنھوں نے آخری شعر میں باطل کو کانٹوں اور حق کو پھولوں کا مترادف ٹھہرایا ہے۔ اکبر کی یہ نظم اودھ پنچ کے دیگر لکھنے والوں کے لیے جہاں ایک مینی فیسٹو (Manifesto) مہیا کرتی ہے، وہیں اِس سے اکبرؔ کی شاعری کے مستقبل کا بھی تعین ہوتا ہے۔ مذکورہ نظم کے اشعار دیکھیے:

سینے اک اور نکتۂ خوب
آزادیٔ گفتگو ہے معیوب
لاتا ہوں دلیلِ شاعرانہ
دیکھو قدرت کا کارخانہ

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

منہ کے اندر زباں جڑی ہے
دانتوں کے حصار میں پڑی ہے
اس قید میں جب کہ یہ زباں ہے
آزادیٔ گفتگو کہاں ہے
باریک ہے گو یہ نکتہ اے دل!
لازم ہے سمجھ لیں اس کو عاقل
مرضی تھی خدائے جسم وجاں کی
محدود ہوں شوخیاں زبان کی
دریائے خیال، موجزن ہے
وقفِ یزداں واہر من ہے
ہے شارعِ عام حق وباطل
ناظر اس کی ہے فکرِ عاقل
باطل پہ نہ جاؤ حق کو سن لو
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو (۴)

نوآبادیاتی سیّاق میں اکبرؔ کی نظم نگاری کا مطالعہ کرتے ہوئے اُن کی نظم 'دربارِ دہلی' اپنے غنائی لہجے اور رمزیہ اسلوب کی بدولت اکبرؔ کے کلام میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ وائسرائے لارڈ کرزن (George Nathaniel Curzon) کی آمد پر منعقد ہونے والے دربارِ دہلی میں گو اکبرؔ خود شریک نہیں ہوئے تھے، لیکن اُس وقت کے مختلف ذرائع ابلاغ سے حاصل ہونے والی معلومات کے ذریعے اُنھوں نے اس دربار کا جو نقشہ اپنی نظم میں کھینچا، وہ انتہائی پُراثر ہے۔ اس نظم میں 'ہم' اور 'وہ'، 'گورے' اور 'نیٹو'، 'استعمار کار' اور 'استعمار زدہ' کے درمیان کھینچی گئی لکیروں کو ایک ایسے رمزیہ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے کہ مذکورہ عہد کی ساری سیّاسی کش مکش واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ چند مصرعے دیکھیے:

ایک کا حصہ من و سلوا
ایک کا تھوڑا حلوہ
ایک کا حصہ بھیڑ اور بلوا

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

میرا حصہ دُور کا جلوا[۵]

شاعر نے پہلے تین مصرعوں میں جن 'تین طبقات کی طرف اشارہ کیا ہے اُن میں پہلا طبقہ تو استعمار کاروں کا ہے، جو مقامی باشندوں کے معاشی استحصال کی بدولت زمین پر ہی آسمانی رزق کے حقدار بن بیٹھے ہیں۔ 'من سلوا' مذہبی روایت کی رُو سے وہ رزق تھا، جو ایک خاص زمانے میں اللہ کے مقرب بندوں کے لیے آسمان سے اترا کرتا تھا اور اس کے لیے اُنھیں کوئی تگ ودَو نہیں کرنا پڑتی تھی۔ اکبرؔ نے رمزیہ پیرائے میں استعمار کاروں کے مقامی وسائل پر اجارے کو ایسی صورتِ حال سے تعبیر کیا ہے، جس میں مقامی باشندوں کی دولت باآسانی سات سمندر پار منتقل کر دی جاتی ہے۔ دوسرا طبقہ جس کی قسمت میں 'تھوڑا حلوا' ہے، وہ مقامی اشرافیہ یا بورژوا طبقہ ہے، جو استعماکاروں کا رنگ ڈھنگ اختیار کر کے اُن سے اپنے لیے کچھ نہ کچھ مراعات حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ تمام لوگ جو انگریزی تعلیم اور مغربی تہذیب کے طور طریقے اپنا کر انگریزوں کا قرب حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، اکبرؔ کی شاعری کا بڑا حصہ اُنھی کو ہدفِ تنقید بناتا ہے۔ نو آبادیاتی تھیوری کے بنیاد گزار فرانز فنین بھی اپنی تحریروں میں مقامی اشرافیہ کے اسی دہرے اور منافقانہ کردار کو جگہ جگہ بیان کرتے ہیں۔ مقامی بورژوا طبقہ جو استعمار کار کے قائم مقام بننے کے خواب دیکھ رہا ہوتا ہے، مقامی باشندوں کے ساتھ استعمار کاروں جیسا ہی طرزِ عمل رکھتا ہے۔ تیسرے مصرعے میں اُن استعمار زدہ مقامی باشندوں کی طرف اشارہ ہے جو بالآخر اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کا علم اُٹھا لیتے ہیں۔ ردِ استعماریت کے اس عمل میں اُن کی حیثیت منظّم نہیں ہوتی اور وہ قیادت کے فقدان کے علاوہ صحیح راستے کے انتخاب کے بارے میں بھی ظن و تخمین کا شکار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ عہد میں وہ ایک ایسے ہجوم کی شکل میں نظر آتے ہیں، جو استعمار کاروں کے خلاف اپنا غصہ نکالنے کے لیے محض ہنگامہ آرائی اور بلوے تک محدود رہتا ہے۔ درج بالا تینوں طبقوں کی باہمی کش مکش کے دوران ہی 'دربارِ ہند' منعقد کیا گیا تھا۔ اِس تمام پس منظری میں نظم کے متکلم کی حیثیت محض اُس مبصر کی ہے جو حالات کا پورا شعور رکھنے کے باوجود بھی کسی قسم کی سیاسی گہما گہمی کا حصہ نہیں بن رہا اور محض دُور سے جلوہ دیکھنے پر اکتفا کر رہا ہے:

اَوج برٹش راج کا دیکھا
پر تو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا
رُخ کرزنؔ مہراج کا دیکھا[۶]

یہ نظم پڑھتے ہوئے قاری کو یہ یاد رہنا چاہیے کہ اکبرؔ جس زمانے میں 'جلوۂ دربارِ ہند' جیسی نظمیں لکھ رہے تھے، اُس زمانے میں استعمار کاروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا سب سے مشکل کام تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا لکھتے ہیں:

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

"یہ نظم اُس زمانے میں لکھی گئی جب انگریزی عملداری ہندوستان میں اپنے عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔۔۔۔ برطانوی حکومت کے اس عروج کے زمانے میں اس پر کھلم کھلا تنقید کرنا ممکن نہیں تھا۔ مگر محض توصیف اکبر کے حق بین ذہن سے بعید تھی اس لیے انہوں نے ایہام اور علائم کے ذریعے تنقید کی جسے ہندوستان کے وہی افراد سمجھ سکتے تھے جو اُردو شاعری کی روایت سے آگاہ تھے۔"(۷)

آگے چل کر نظم اُس وقت مزید رمزیت سے بھرپور ہو جاتی ہے جب بالواسطہ طرزِ اظہار کے ذریعے مغربی استعمار کاروں کے مقامی حامیوں کو 'بندر' کہ کر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔ بر سبیلِ تذکرہ عرض کرتا چلوں کہ انگریزوں کے ماتحت کام کرنے والوں کو 'بندر' قرار دینا چارلس ڈارون کے اُس نظریہ ارتقاء کی طرف کنایہ کرتا ہے جسے اکبرؔ نے اپنے اشعار میں متعدد جگہوں پر ہدفِ تنقید بنایا ہے۔ یہ قطعہ دیکھیے:

ڈراون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے
میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے
اپنی حالت کے مطابق چاہیے طرزِ عمل
اِس سے کیا ہوتا ہے دادا قیصر و غفور تھے(۸)

یہ قطعہ انیسویں صدی کے اواخر کا ہے جب کہ 'جلوۂ دربارِ ہند' کا سنِ تصنیف ۱۹۰۳ء ہے۔ اکبرؔ سات سمندر پھاند کر آنے والے مغربی استعمار کاروں کے مقامی حامیوں کو اس لیے موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کیوں کہ اُن کی اعانت کے بغیر استعمار کار کبھی بھی مقامی آبادی کو اپنے زیرِ نگیں نہیں رکھ سکتے تھے۔ اِن 'بندروں' کی خود ساختہ حکمت و دانش کو ہدفِ تنقید بنانے کے لیے، انھیں 'سکندر' کے لقب سے یاد کرنا ایک زہر خند نشتر کا درجہ رکھتا ہے۔ نظم کے اگلے ہی بند میں استعمار کاروں کی بلند بختی کا ذکر کرنے کے فوراً بعد متکلم کو اپنی قوم کی بے بسی کا احساس ہونا، نو آبادیاتی جبر کی سنگینی کو مزید واضح کرتا ہے۔ اشعار دیکھیے:

پہونچے پھاند کے سات سمندر
تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش اُن کے اندر
اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوجِ بخت ملاقی اُن کا
چرخِ ہفت طباقی اُن کا
محفل اُن کی ساقی اُن کا

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

آنکھیں میری باقی اُن کا[۹]

اکبرؔ نے اپنی نظم نگاری کے ابتدائی دور میں مقامی تہذیبی و ثقافتی اقدار کو بچانے کے لیے جس شدت سے سر سیّد احمد خان اور اُن کے ساتھیوں کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے، اُس کی وجہ سے کچھ ناقدین نے اکبرؔ پر ماضی پسندی اور تعصب کے الزامات لگائے ہیں، مثلاً سلیم احمد کے الفاظ میں:

''اُنھوں نے جدید کی کوتاہیوں اور خامیوں، کمزوریوں اور لغزشوں پر نکتہ چینی کی۔ اُس کی خوبیوں کا اعتراف نہ کیا۔ اُن کے مزاج میں جذباتیت تھی حقیقت پسندی نہ تھی۔ اِسی لیے اُنھیں ماضی سے عقیدت اور لگاؤ تھا اور حال سے نفرت اور بے زاری۔''[۱۰]

اکبرؔ کی ایسی نظموں کے مطالعے سے یہ بات بھی عیاں ہوتی ہے کہ وہ مزکورہ عہد میں ایک ایسی مکالماتی فضا کی تشکیل چاہتے تھے، جس میں استعمار کاروں کی حمایت اور مخالفت کے بیانیے کھل کر قاری کے سامنے آئیں، اور وہ خود کھرے کھوٹے کی پہچان کر سکے۔ ایک اور نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

سیّد سے آج حضرتِ واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جابجا ترے حالِ تباہ کا
سمجھا ہے تو نے نیچر و تدبیر کو خدا
دل میں ذرا نہ اثر رہا لا الہ کا
ہے تجھ سے ترکِ صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا
شیطان نے دکھا کہ جمالِ عروسِ دہر
بندہ بنا دیا ہے تجھے جبِ جاہ کا
اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہے وہ کانٹا ہے راہ کا
یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر
گزرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا
آئے نظر علوم جدیدہ کی روشنی
جس سے خجل ہو نور رُخِ مہر ماہ کا

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

پتلوں و کوٹ و بنگلہ و بسکٹ کی دُھکن بندھے
سو دا جناب کو بھی ہوٹر کی کلاہ کا
منبر پہ یوں بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب و گناہ کا(۱۱)

اس نظم میں اکبرؔ استعماری کلامیوں اور مذہبی کلامیوں کے مابین جاری کش مکش کو انتہائی سیدھے اور سادہ انداز میں قاری کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اکبرؔ کے نزدیک مغربی تہذیب کی اجارہ داری اُن تہذیبی اور اخلاقی اقدار کی پسپائی ہے، جو ہمیشہ سے مشرق کا حسن رہے ہیں، اِسی لیے وہ اپنی مذہبی اور ثقافتی اقدار کو ترک کر کے مغربی تہذیب کی رنگینیوں میں کھو جانے کو شیطان کی پیروی کے مترادف قرار دیتے ہیں۔ درج بالا مصرعوں میں بھی اکبرؔ نے سر سیّد اور اُن کے ہم نواؤں کو دنیا کے راحت و آرام اور آسائشوں کے پیچھے بھاگنے پہ موردِ الزام ٹھہرایا ہے، اکبرؔ کے شعری بیانیوں میں کی جانے والی اِس تنقید کی جڑیں دراصل اُن معاشرتی مسائل میں گڑی ہوئی تھیں، جن کا براہِ راست تعلق ہمارے تہذیبی و ثقافتی انحطاط سے تھا۔ سمیم حنفی کے بقول:

"اکبر کی توجہ کا اصل مرکز ہماری دنیا میں ایک طرح کی مرکزی حیثیت رکھنے والے معاشرتی اور ثقافتی مسئلے تھے۔ ان میں مغرب کے ہاتھوں مشرق کے مادی اور تہذیبی استحصال کا مسئلہ بھی شامل ہے اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ شہر آشوب لکھنے والوں سے کہیں زیادہ گہرائی کے ساتھ اکبر نے اپنے عہد کے آشوب کو سمجھا ہے۔"(۱۲)

اکبرؔ کی ابتدائی شاعری میں ہمیں مغربی تہذیب سے انحراف کی جو روش ملتی ہے، وہ اُس پر شکوہ ماضی کی ہی بازیافات کا تقاضا کاتی ہے، جس کے ذریعے مقامی باشندے اپنی کھوئی ہوئی عظمتِ رفتہ کو مستقبل کی راہیں کھولنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ جو عظیم ہندوستان اکبرؔ کے محافظے میں محفوظ تھا، اُس میں ہندو اور مسلم دو الگ اکائیوں کی بجائے ایک اکائی کے طور پہ متحد تھے اور صدیوں میں تشکیل پانے والی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے بھی امین تھے۔ سر سیّد احمد خان کی وفات کے بعد اکبر کی نظموں میں جہاں علی گڑھ تحریک اور اُس سے وابستہ عمائدین کے بارے میں طنز و تشنیع کے نشتر بتدریج کم ہوتے چلے گئے وہیں وہ ایک ایسے مصلح کے طور پر سامنے آئے جسے مغربی استعمار سے نجات کا واحد حل ہندو مسلم اتحاد میں نظر آتا تھا۔ دو اشعار دیکھیے:

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو
اور پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو
حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات
دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو(۱۳)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

یہی وجہ ہے کہ ہندو اور مسلم قوموں کو قریب لا کر مشترکہ جدوجہد سے آزادی حاصل کرنے کی سوچ نے اکبؔر کو جس قومی اور ملیّ دھارے میں شریک کیا، اُس کے سوتے گاندھی جی کی طلسماتی شخصیت سے پھوٹے تھے۔ علی احمد فاطمی کے بقول گاندھی جی کی جو بات انھیں پسند آئی وہ ان کی اخلاقی اور روحانی طاقت تھی۔ مشرقیت اور آدمیت میں بھی ہندو مسلم کی تفریق سے بالاتر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز سے اکبر کی وفات تک اُن کی شخصیت اور فن پر گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کے نعروں کی گہری چھاپ دکھائی دیتی ہے۔ خصوصاً اکبؔر کی وفات کے ستائیس برس بعد مُرتب ہونے والی کتاب گاندھی نامہ میں موجود ردِ استعمار بیانیوں پر گاندھی کی فکر کے کافی اثرات ہیں۔ گو اکبؔر گاندھی جی کو ہدفِ تنقید بنانے سے بعض نہیں آتے، لیکن مذکورہ عہد میں کوئی اور ہندوستانی رہنما اُنھیں گاندھی جتنا پُرکشش نظر نہیں آتا۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں فکری طور پر اکبؔر مسلمانوں کے اس طبقے کے نمائندہ تھے، جسے برطانوی سامراج سے آزادی کی واحد راہ ہندو مسلم اتحاد میں نظر آتی تھی، لہٰذا وہ اُس مقامی بورژوا طبقے کے سخت خلاف تھے، جو بنام مذہب سیاست کر کے مقامی باشندوں کی طاقت کو تقسیم کر رہا تھا۔ اِنھی معروضات کے سیّاق میں اکبؔر کی ایک نظم کے یہ اشعار دیکھیے جن میں اُنھوں نے اُس بورژوا طبقے کی گوشمالی کی ہے، جو مغربی استعمار سے اپنے ذاتی مفادات اور آسائشوں کے حصول کے لیے کوشاں تھا۔ اکبؔر کی زبانی اِس طبقے کا حال سنیے:

حکومت اور دولت کی جو دے چاٹ
تو بن جائیں گے آخر یہ ترے بھاٹ
عداوت مذہبی جو ہے پُرانی
ابھار ان کو بہ انداز نہانی
مجھے معلوم ہیں نیٹو خصائل
کہاں یہ وحدتِ ملکی پہ مائل
کوئی دادر کو اپنے رٹ رہا ہے
کوئی ایک جانور پر کٹ رہا ہے
زباں ہی پر کوئی دیتا ہے یاں جان
معانی ہوتے ہیں لفظوں پہ قربان
حقیقت میں ہیں یہ سب شرک آلود
اسی سے تُو ہے ان کے سر پہ موجود

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

کوئی اِن میں سے ایسا خود غرض ہے
کہ قومی بحث کو سمجھا مرض ہے
غرض ذاتی تو اس کی کر دے پوری
تو ہے منظور اس کو سب سے دُوری
تو رہ بیدار اور مصروفِ جسٹس
سمجھ لے بے اثر نیٹو کی گھس گھس (۱۴)

"گاندھی نامہ" کی شاعری کو بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اِس کتاب کی نظموں میں اکبؔر کی سیاسی اور فکری وابستگیوں کے علاوہ اُن کی ملّی اور سیاسی تغیرات کا بھی بیانیہ ملتا ہے، جو مغربی استعمار اور مقامی باشندوں کی باہمی کشاکش کا زائیدہ تھا۔ خصوصاً پہلی جنگِ عظیم کے دوران اور اُس کے فوراً بعد میں مقامی باشندوں کے ہاں جس ذہنی بیداری کا آغاز ہوا تھا، اُس کے واضح اثرات گاندھی نامہ کی نظموں میں موجود ہیں۔ ڈاکٹر فخر الکریم کے الفاظ میں:

> "گاندھی نامہ بیسویں صدی کے ربع اول کے سیاسی انتشار کا بہت عمدہ مرقع ہے جس میں انھوں نے اپنے ہی عہد کے سماج، سیاست، مذہب، اخلاق، معیشت، ادب اور روحانیت کو بڑے ہی معروضی انداز میں پیش کیا ہے۔ جس میں ایک نقطہ نظر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ سماج کے سبھی طبقوں کے خیالات کا احاطہ کیا گیا ہے اور آخر میں نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔" (۱۵)

بیسویں صدی کے ربع اول میں اکبؔر کی نظموں میں 'شیخ'، 'برہمن'، 'آبِ زم زم'، 'گنگا جل'، 'وعظ'، 'مومن' اور 'عشقِ بتاں' جیسی تہذیبی علامتیں، کلاسیکی پس منظر کی بجائے ایک نئے سیاسی سیّاق میں اپنا ادراک کرواتی ہیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہو گا کہ اودھ پنچ کے آغاز ۱۸۷۷ء سے اکبؔر نے جو کاٹ دار طنزیہ اسلوب اپنایا تھا، آخری عمر تک پہنچتے، اُس پر کہولت کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ اِس تبدیلی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اکبؔر کی توجہ مغربی تہذیب کو ہدفِ تنقید بنانے کی بجائے، اُن سیاسی کلامیوں کی طرف مبذول ہو گئی تھی، جن کے ذریعے استعمار سے چھٹکارے کی امید پیدا ہونے لگی تھی۔ گاندھی جی کو قومی آزادی کے حصول کی خاطر قومی اُمیدوں اور آرزوؤں کا مرکز بنانے کے بعد، اکبؔر اپنے اشعار کے ذریعے پوری تندہی سے 'ہندو مسلم اتحاد' کے داعی نظر آتے ہیں۔ اِس بات سے انکار ممکن نہیں کہ مذکورہ عہد میں اُن کی نظم نگاری کئی جگہوں پر سیاسی نعرہ بازی میں تبدیل ہو جاتی تھی، لیکن اُس کی تہ میں استعماری جکڑ بندیوں سے نجات کی خواہش کو پوری شدت سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

آبِ زمزم سے کہاں میں نے ملا گنگا سے کیوں

کیوں تری طینت میں ایسی ناتوانی آ گئی"
وہ لگا کہنے کہ "حضرت آپ تو دیکھیں ذرا
بند تھا شیشی میں، اب مجھ میں روانی آ گئی
اس سوچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں
گاندھی تو ہیں وجد میں یہ کیوں اچھل رہے ہیں
نشو و نمائے کونسل جن کو نہیں میسر
پبلک کی جے میں اُن کے مضمون پل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپلیں، ریاد اور دلیلیں
اور کبرِ مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں
یہ سارے کارخانے اللہ کے ہیں اکبؔر
کیا جائے دل زدن ہے یوں ہی یہ چل رہے ہیں (۱۶)

پہلے دو اشعار میں 'آبِ زمزم' اور 'گنگا جل' کی علامتوں کے ذریعے اکبؔر سامراج سے چھٹکارے کے لیے جہاں دونوں اقوام کو ایک ہونے کی دعوت دے رہے ہیں وہیں مسلمانوں کو کانگریس سے علاحدہ ہونے پہ طنز کا نشانہ بھی بنا رہے ہیں۔ اِن اشعار میں مسلمانوں کو یہ واضح پیغام دیا گیا ہے کہ ہندو قوم کو ساتھ ملائے بغیر، وہ کسی صورت اپنی آزادی واپس نہیں لے سکتے۔ دوسرے قطعے میں بھی راست بیانیے کے ذریعے اُس سیاسی صورتِ حال کو سامنے لایا گیا ہے، جس میں سیاسی اور قومی شعور کی بیداری کے ساتھ ہی تیزی آنا شروع ہو گئی تھی۔ 'کونسل'، 'پبلک'، 'وفد'، اپلیں'، 'ریاد' اور 'دلیلیں' مذکورہ عہد میں تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے کو واضح کر رہے ہیں۔

اکبر الہ آبادی کی نظم نگاری حقیقی معنوں میں استعماری تہذیب و ثقافت کے خلاف مزاحمت کا اعلامیہ تھی۔ اُن کی نظم نگاری کا نو آبادیاتی سیّاق میں کیا گیا مطالعہ اس اَمر پہ دال ہے کہ اکبؔر نے اپنے معاصر نظم نگاروں کے مقابلے میں کُلی مفاہمت کی بجائے مزاحمت اور انجذاب کی بجائے انحراف کی روِش اختیار کی۔ اکبر کی سرکاری نوکری، بیٹے کی مغربی تعلیم اور ملکہ وکٹوریہ کی شان میں لکھے گئے قصیدے کو بنیاد بنا کر شعریاتِ اکبر کو موردِ الزام ٹھہرانے والوں کو یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دوران میں استعمار کاروں کے ہاتھوں شہید ہونے والے مولوی باقر کا بیٹا مولانا حسین آزاد جب نیچرل شاعری کے منصوبے کو پروان چڑھا رہا تھا اور حالؔی جیسا قوم کا درد رکھنے والے بھی حالات کے جبر سے مجبور ہو کر ہند پر 'سایۂ قیصر' کا تمنائی تھا، اکبؔر نے اُس وقت بھی (سرکاری ملازمت کے باوجود) استعمار کاروں، اُن کے حلیفوں اور مغربی تہذیب کے مقابل مزاحمت کا علَم اُٹھایا ہوا تھا۔ جبر و استحصال کے یخ بستہ موسم میں 'شاہدِ معنی

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

'نے ظرافت کا لحاف' ضرور اوڑھ رکھا تھا، لیکن استعمار کاروں کے جور واستبداد کی ہر سختی کو وہ اپنے دل پہ محسوس کر کے شعری قالب میں ڈھالتا تھا۔

مرا کینہ نتیجہ ہے جفائے چرخِ گرداں کا
مرا پینا ہے منبع سیلِ اشکِ چشم گریاں کا
مرا جینا ہے بس اِک سلسلہ انفاسِ سوزاں کا
مرا سینہ ہے مشرق آفتابِ داغِ ہجراں کا
طلوعِ صبحِ محشر چاک ہے میرے گریباں کا(۱۷)

اکبر الہ آبادی کی شاعری میں مغربی استعمار کے خلاف بیانیہ بنیادی طور پر تہذیبی، اخلاقی اور ذہنی مزاحمت کی صورت میں سامنے آتا ہے جس میں وہ براہِ راست سیاسی نعروں کے بجائے طنز، مزاح اور تضادِ اقدار کے پیرائے میں نو آبادیاتی نظام کی اصل روح کو بے نقاب کرتے ہیں۔ ان کے ہاں مغربی استعمار محض انگریز حکومت کا نام نہیں بلکہ وہ پورا نظام ہے جو مقامی تہذیب، دینی شعور، سماجی اقدار اور زبان کو کمزور کر کے ترقی کے نام پر غلامی کو خوشنما بنا دیتا ہے اسی لیے وہ پتلون، کوٹ، انگریزی تعلیم، مغربی طرزِ معاشرت اور اندھی نقالی کو بطور علامت برت کر دکھاتے ہیں کہ کس طرح سامراج انسان کو اپنی جڑوں سے کاٹ کر ایک مقلد، بے شناخت اور روح سے خالی وجود میں بدل دیتا ہے۔ اکبر کی شاعری میں بار بار یہ احساس ابھرتا ہے کہ مسلمان اگر اپنی دینی و تہذیبی بنیادوں کو چھوڑ کر مغرب کی ظاہری چمک دمک کے پیچھے بھاگیں گے تو وہ سیاسی طور پر ہی نہیں، فکری اور اخلاقی سطح پر بھی غلام بن جائیں گے چنانچہ ان کا ردِ استعمار بیانیہ اندرونی اصلاح، خودی کی حفاظت، اپنی زبان و تہذیب سے وفاداری اور سامراجی ترقی پر ناقدانہ نظر ڈالنے کی دعوت دیتا ہے، جس سے ان کی شاعری ایک بیدار کن، مزاحمتی شعور پر مبنی ادبی ثبوت بن کر سامنے آتی ہے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

حوالہ جات

1۔ اشفاق احمد، اُردو میں مزاحمتی شاعری، تاریخ اور تجزیہ، مقالہ برائے ایم۔اے اُردو، گورنمنٹ کالج، لاہور، 1991ء، غیر مطبوعہ، ص:17

2۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اکبر تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۱

3۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، کراچی: پنجاب پبلشرز، س ن، ص ۱۶۷

4۔ ایضاً، ص ۱۷۰

5۔ ایضاً، ص 148

6۔ ایضاً، ص 155

7۔ خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر، اکبر تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، ص 287

8۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، ص ۱۹۳

9۔ ایضاً، ص ۱۵۸

10۔ سلیم احمد، اکبر کی تنگ نظری، مشمولہ: اکبر اس دور میں (مرتبہ: اختر انصاری الہ آبادی)، کراچی: بزم اکبر، ۱۹۵۲ء، ص ۱۳۷

11۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، ص ۱۶۵

12۔ شمیم حنفی، اکبر کی معنویت، مشمولہ: سر سید سے اکبر تک، (مرتبہ: شمیم حنفی، سہیل احمد فاروقی)، نئی دہلی: مکتبہ جامع لمیٹڈ، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸۹

13۔ اکبر الہ آبادی، گاندھی نامہ (مرتبہ: ڈاکٹر فخر الکریم)، اشاعت دوم، الہ آباد: ادارۂ نیا سفر، ۲۰۱۰ء، ص ۳۰

14۔ ایضاً، ص ۳۹۔۴۰

15۔ ایضاً، ص ۲۰

16۔ ایضاً، ص ۳۱

17۔ اکبر الہ آبادی، کلیاتِ اکبر، ص ۶۸